بحث ونظر

فلسفۂ نظم قرآن

ایک تنقیدی جائزہ

مولانا محمد عنایت اللہ اسد سبحانی

سہ ماہی تحقیقات اسلامی کا جنوری۔ مارچ ۱۹۹۵ء کا شمارہ پیش نظر ہے۔ اس میں ایک مضمون کا عنوان ہے: "فلسفہ نظم قرآن ۔ متوازن نقطۂ نظر"۔

نظم قرآن چونکہ میری دلچسپی کا خاص موضوع ہے، اس لیے یہ عنوان دیکھ کر فطری طور پر مجھے خوشی ہوئی اور میں اسے دیکھنے لگا۔ کرنے کو تو میں نے مضمون شروع کر دیا، مگر اس کے اختتام تک پہنچنے کے لیے مجھے کتنے پہلو بدلنے پڑے اور کتنی ریاضت کرنی پڑی، اسے بیان کرنا مشکل ہے۔

مضمون کے مطالعہ سے نمایاں طور پر اس کی جو خصوصیات سامنے آتی ہیں، وہ حسب ذیل ہیں:

مضمون کا انداز غیر علمی اور غیر سنجیدہ ہے۔ شروع سے آخر تک کھوکھلے اور بے بنیاد دعوے ہیں، کھلی ہوئی زیادتیاں اور غلط بیانیاں ہیں، غلط محاورے اور غیر محتاط جملے ہیں۔ تحریر میں زبردست الجھاؤ ہے۔ سطر سطر سے ذہنی افلاس اور فکر و نظر کی بے مائگی جھلکتی ہے۔ علم و تحقیق کے نام سے علم و تحقیق کا مذاق اڑایا گیا ہے۔

مختصر یہ کہ "فلسفۂ نظم قرآن" نامی اس مضمون میں فلسفہ کم اور سفسطہ زیادہ ہے۔

ذیل میں ہم قدرے تفصیل سے ان نکات کو واضح کرنے کی کوشش کریں گے۔

کھلی ہوئی غلط بیانی

مقالہ نگار نظم قرآن کے مسئلہ میں غلو سے پرہیز کی دعوت دیتے ہوئے رقمطراز ہیں:

"اس پس منظر میں ہند میں تفسیر کے ایک خاص مکتب فکر کی طرف سے جو

نظم قرآن کو دین و ایمان کا اصل مسئلہ، اور اس کی طرف عدم توجہ کو امت کی تمام خرابیوں کی جڑ، اور اس کے تمام تر افتراق و انتشار کا ذمہ دار قرار دیا گیا ہے، یہ مبالغہ آمیز ہے" ص۷۲

پھر آگے چل کر وہ مزید فرماتے ہیں:

"قرآن و سنت کی تعبیر اور دین کے کسی حصہ کی ترجمانی کی اصل خوبی یہ ہے کہ اس کے ہر مرحلہ میں اعتدال و توازن سے رشتہ استوار رہے اور تعبیر کے کسی جزء میں مبالغہ آرائی، غلو اور تشدد کو در آنے کا موقع نہ ملے" ص۷۳

ان سطور میں فراہی مکتب فکر پر غلو، تشدد اور مبالغہ آرائی کا الزام جس تحریر کے حوالہ سے لگایا گیا ہے، وہ فاتحہ تفسیر نظام القرآن کے صفحہ ۳-۴ کی ایک عبارت ہے جس کا اردو ترجمہ ہم یہاں نقل کیے دیتے ہیں، تاکہ قارئین خود اندازہ کر سکیں کہ مقالہ نگار امانت و دیانت کے تمام حدود کو پھلانگتے ہوئے کس طرح سورج کو چراغ دکھانے اور نور کو ظلمت ثابت کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔

علامہ فراہیؒ کی عبارت

ترجمان القرآن علامہ فراہیؒ فرماتے ہیں:

"یہ ایک واضح سی بات ہے کہ نظم کلام کلام ہی کا ایک جزء ہوا کرتا ہے۔ اب اگر اسے چھوڑ دو تو کلام کے مفہوم و معنی کا ایک حصہ غائب ہو جائے گا۔

ترکیب میں زائد مفہوم پیدا ہو جاتا ہے، جو اس کے الگ الگ اجزاء میں نہیں ہوا کرتا۔ لہٰذا یہ بات یقینی ہے کہ اگر کوئی فہم نظام سے محروم رہ گیا تو وہ کلام کے ایک بڑے حصے سے محروم رہ جائے گا۔ اور بہت اندیشہ ہے کہ اس کا وہی حال ہو جائے جو اس سے پہلے اہل کتاب کا ہوا۔ جیسا کہ قرآن نے بیان کیا ہے۔

فنسوا حظا مما ذکروا بہ فاغرینا بینہم العداوۃ والبغضاء الی یوم القیامۃ (پس انھوں نے ایک بڑا حصہ اس کتاب کا فراموش کر دیا، جس کے ذریعہ ان کی یاددہانی کی گئی تھی۔ چنانچہ ہم نے ان کے درمیان قیامت تک کے لیے دشمنی اور جھگڑے کی آگ بھڑکا دی۔)

مجھے اندیشہ ہوتا ہے کہ یہ باہمی عداوت اور دشمنی جس میں یہ امت مسلمہ مبتلا

ہے کہیں یہ اسی نسیان کا نتیجہ نہ ہو۔ صورتِ حال یہ ہے کہ ان کی عداوتوں کی آگ بجھنے کا نام نہیں لیتی۔ اور ان کے آپس کے اختلافات ختم ہونے پر نہیں آتے۔

اس کی وجہ وہی ہے جو ہم نے پہلے بیان کی، کیونکہ جب کلامِ الٰہی کے معانی میں ہمارے درمیان اختلاف ہوگا تو لازماً ہماری خواہشوں میں بھی اختلاف ہوگا اور ہمارا وہی حال ہو جائے گا جو اہلِ کتاب کا ہوا۔ فرق بس اتنا ہوگا کہ وہ اپنے اختلافات سے نجات پانے کے لیے اس نبی اور اس قرآن کا انتظار کر رہے تھے اور ہمارے لیے اس کتاب محفوظ کے علاوہ کوئی اور چیز نہیں رہ گئی۔"

علامہ فراہیؒ کی یہ وہ تحریر ہے جسے لے کر مضمون نگار نے اس مکتبِ فکر پر غلو، تشدد، مبالغہ آرائی اور قرآن و سنت کی تعبیر میں بے اعتدالی کا الزام لگایا ہے

خاک اڑانے کا حاصل؟

سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس تحریر کے کس جزء سے وہ سارے نکتے پیدا ہو رہے ہیں، جن کی دریافت سے فاضل مضمون نگار اس قدر مضطرب ہیں؟

کس نے کہا ہے، نظمِ قرآن دین و ایمان کا اصل مسئلہ ہے؟

کس نے کہا ہے، نظمِ قرآن سے بے توجہی امت کی تمام خرابیوں کی جڑ ہے؟

کس نے کہا ہے، امت کے تمام تر افتراق و انتشار کی اصل وجہ نظمِ قرآن سے غفلت ہے؟

علامہ فراہیؒ نے جو بات فرمائی ہے، وہ تو بہت ہی واضح اور صاف ہے۔ کوئی بھی صاف ذہن کا آدمی اسے پڑھے تو ممکن نہیں اسے کوئی غلط فہمی ہو۔

کیا کوئی بھی پڑھا لکھا بالغ نظر آدمی اس سے انکار کر سکتا ہے کہ نظم کلام، کلام کا ہی ایک جزء ہوا کرتا ہے؟

اب اگر نظمِ کلام کلام کا ہی جزء ہوا کرتا ہے تو کیا نظمِ قرآن، قرآن کا ہی جزء نہ ہوگا؟ پھر اگر نظمِ قرآن بھی قرآن کا ہی جزء ہے، تو کیا اسے سمجھنا، اس پر غور کرنا، اور اس کی وسعتوں اور گہرائیوں تک پہنچنے کی کوشش کرنا ہمارے لیے ضروری نہ ہوگا؟

پھر یہ بات ہمیں خود قرآن پاک سے معلوم ہوتی ہے کہ یہ دلوں کو جوڑنے والی

کتاب ہے۔ اسی کتاب کی بدولت وہ لوگ جو کبھی ایک دوسرے کے جانی دشمن تھے، اور باہمی نفرت وعداوت کی آگ میں جل بھن رہے تھے، دیکھتے دیکھتے باہم شیر وشکر اور یک جان دو قالب ہو گئے۔

کیا اس سے یہ بات نہیں نکلتی ہے کہ یہ امت اگر اس کتاب سے غافل ہوئی تو اخوت ومحبت کی نعمت سے وہ محروم ہو جائے گی اور اس کی صفوں میں پھر وہی دشمنیاں عود کر آئیں گی، جن میں وہ پہلے مبتلا تھی؟

اب اگر آج ایک صاحب دل اور صاحب نظر اپنے سر کی آنکھوں سے یہ دیکھتا ہے کہ امت قرآن سے غافل ہے، ساتھ ہی یہ بھی دیکھتا ہے کہ اس کی وحدت بالکل پارہ پارہ ہو چکی ہے اور اس سے اس کو یہ خیال ہوتا ہے کہ اس انتشار وافتراق کا سبب شائد قرآن سے بے اعتنائی اور فہم قرآن سے محرومی ہے، تو آخر اس میں کیا چیز ہے جسے غلو یا تشدد، یا بے اعتدالی کا نام دیا جا سکتا ہو؟

قابل لحاظ چیز یہ ہے کہ اس صاحب نظر نے یہ بات بھی ادّعائی انداز میں نہیں کہی ہے، بلکہ نہایت ہی دردمندی اور منکسر مزاجی کے ساتھ یہ فرمایا ہے کہ مجھے یہ اندیشہ ہوتا ہے کہ.....

فکر ونظر کی بے مائگی

اسی نظم قرآن پر مزید برہمی کا اظہار کرتے ہوئے فاضل مضمون نگار رقم طراز ہیں:

"قرآن نے جو اس امت کو خیر امت کہا ہے تو اس میں یہ بات بھی شامل ہے کہ قیامت تک کے لیے اس امت کی یہ خیریت اسی طرح باقی رہے گی یہی بات ہے جو حدیث میں اس طرح کہی گئی ہے کہ قیامت تک یہ امت دین کے صحیح راستے پر قائم رہے گی۔ نیز یہ کہ یہ امت کبھی بھی گمراہی پر اکٹھا نہ ہوگی..... جس امت کا قرآن و سنت میں یہ مقام ہو، اسے محض نظم قرآن میں غفلت سے یہود و نصاریٰ کی روش پر عمل پیرا، اور ان کے گناہوں کی مجرم نہیں گردانا جا سکتا، جیسا کہ نظم قرآن کے مؤید مخصوص حلقے کی طرف سے اسے اسی جرم کا مرتکب قرار دیا گیا ہے۔"[۴۲]

خیر امت ہونے کا مسئلہ

یہاں مضمون نگار سے ہم یہ پوچھنا چاہیں گے کہ آیت کریمہ میں خیر امت کسے کہا گیا ہے ؟ اور جنھیں کہا گیا ہے تو غیر مشروط طور پر کہا گیا ہے یا کچھ متعین شرطوں کے ساتھ کہا گیا ہے ؟

اگر مشروط طور پر کہا گیا ہے، اور ظاہر ہے کہ مشروط طور پر کہا گیا ہے، تو کیا ان شرطوں کے بغیر بھی کوئی گروہ خیر امت کہا جا سکے گا ؟

پھر جو بات مشروط طور پر کہی گئی ہو، کیا اس کے بارے میں یہ دعویٰ کرنا صحیح ہوگا کہ وہ بات لازماً قیامت تک باقی رہے گی ؟

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے :

سیأتی علی الناس زمان یکون القرآن فی وادٍ وھم فی وادٍ (سنن نسائی)

(عنقریب اس امت پر ایک دور ایسا آئے گا جب قرآن ایک وادی میں ہوگا، اور یہ امت دوسری وادی میں ہوگی یعنی دونوں کا راستہ الگ الگ ہوگا)

اس حدیث رسول کا کیا مطلب ہے ؟ کیا قرآن سے دور ہو کر بھی یہ امت خیر امت ہی کہی جائے گی ؟

ایک دوسری حدیث آتی ہے :

کیف انتم إذا طغی نساءکم وفسق شبابکم وترکتم جہادکم ؟ (مسند ابو یعلی)

(کیا حال ہوگا تمہارا، جب کہ تمہاری عورتیں سرکش ہو جائیں گی، تمہارے جوان فسق و فجور میں مبتلا ہو جائیں گے اور تم اپنے جہاد سے کنارہ کش ہو جاؤ گے ؟)

تو کیا فسق و طغیان اور ترک جہاد کے بعد بھی یہ امت خیر امت ہی باقی رہے گی ؟

آپؐ کا ارشاد مبارک ہے :

کیف انتم اذا امرتم بالمنکر ونہیتم عن المعروف ؟ (مسند ابو یعلی)

(کیا حال ہوگا تمہارا جب تم بدی کا حکم دینے لگو گے اور نیکی سے روکنے لگو گے ؟)

تو کیا منکر کی علمبردار اور معروف سے برسر پیکار ہوتے ہوئے بھی یہ امت خیر امت ہی باقی رہے گی ؟

یہ الزام ہے یا حقیقت

مضمون نگار کا یہ دعویٰ ہے کہ امت یہود و نصاریٰ کی روش پر عمل پیرا، اور ان کے گناہوں کی مرتکب نہیں ہو سکتی اور اس بات کو وہ نظم قرآن کے مؤید مخصوص حلقے کی طرف سے اس امت پر ایک الزام قرار دیتے ہیں۔

ہم ان سے یہ پوچھنا چاہیں گے کہ یہ حدیثیں بھی کبھی ان کی نظر سے گزری ہیں:

لتتبعن سنن من کان قبلکم شبرًا بشبرٍ وذراعًا بذراعٍ حتی لو دخلوا فی حجر ضب لاتبعتموھم، قلنا یا رسول اللہ الیھود والنصاری؟ قال: فمن؟ (ترمذی)

(یقیناً تم ان لوگوں کے راستوں پر چل پڑو گے جو تم سے پہلے گزرے ہیں، تم میں اور ان میں ایک بالشت اور ایک ہاتھ کا بھی فرق نہ ہوگا۔ یہاں تک کہ اگر وہ گوہ کے بل میں داخل ہوئے ہوں گے، تو تم بھی ان کی پیروی کرو گے اور اس بل میں داخل ہو گے۔ ہم نے عرض کیا، اللہ کے رسول، کیا یہود و نصاری کی پیروی؟ آپؐ نے فرمایا: اور کس کی؟)

ایک دوسری روایت ہے، جو حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے آتی ہے، کہ آپ نے فرمایا:

لیأتین علی امتی ما أتی علی بنی اسرائیل حذو النعل بالنعل حتی إن کان منھم من أتی امہ علانیۃ لکان فی أمتی من یصنع ذالک، وان بنی اسرائیل تفرقت علی ثنتین وسبعین ملۃ وتفترق امتی۔ (ابوداؤد۔ترمذی)

(یقیناً میری امت پر بھی وہ وقت آئے گا جو بنی اسرائیل پر آیا۔ دونوں کے حالات اسی طرح مشابہ ہوں گے جس طرح ایک پیر کا جوتا دوسرے پیر کے جوتے کے مشابہ ہوتا ہے۔ یہاں تک کہ اگر ان میں کوئی ایسا شخص گزرا ہوگا جس نے علی الاعلان اپنی ماں کے ساتھ بدکاری کی ہوگی، تو میری امت میں بھی ایسے لوگ ہوں گے جو یہ کام کریں گے۔ بنی اسرائیل بہتر فرقوں میں بٹ گئے، میری امت بھی اسی طرح بٹ جائے گی)

کیا یہ حدیثیں اس مفہوم میں بالکل واضح نہیں ہیں کہ یہ امت بھی کسی دور میں

یہود و نصاریٰ کی روش پر عمل پیرا ہو جائے گی؟

ہو سکتا ہے فاضل مقالہ نگار یہاں یہ کہہ گزریں کہ یہ احادیث تو نظم قرآن سے مستفاد معلوم ہوتی ہیں، اور ہم کوئی بھی ایسی بات ماننے کے قائل نہیں جو نظم قرآن کی راہ سے آئے۔ ہم رسول پاک کی بھی صرف وہی باتیں مانیں گے جو نظم قرآن کی بو اپنے اندر نہ رکھتی ہوں!

فاضل مقالہ نگار کی جو مزاجی کیفیت ہے، اس سے کوئی بات بھی بعید نہیں، نظم قرآن اور صاحب نظام القرآن سے انھیں جو عناد ہے، وہ ان کی زبان گہر بار سے ہر بات کہلوا سکتا ہے۔

اک ذرا چھیڑیے پھر دیکھئے کیا ہوتا ہے

زبردست ذہنی افلاس

فاضل مقالہ نگار علم و حکمت کے موتی رولتے ہوئے مزید فرماتے ہیں:

"اب اگر سخت گیر نظام قرآن کی بدولت ہر لفظ کے ایک ہی معنی اور ہر آیت کی ایک ہی تاویل کی گنجائش رہے تو اس کا صاف مطلب یہ ہوتا کہ اس مطلوب تفسیر کے بعد کتاب اللہ کے عجائبات ختم ہو گئے اور رب کی باتیں ایک خاص تفسیر کے دائرے میں محدود ہو کر رہ گئیں۔ یہ کتاب اللہ کی مدح نہیں، اس کی قدح ہے" (ص ۹)

وہ لوگ جو علم تفسیر سے دلچسپی رکھتے اور قرآن پاک کی تفسیر کا مطالعہ کرتے ہیں وہ جانتے ہیں کہ ہمارے مفسرین کرام نے ایک ایک آیت کی تاویل میں دو دو درجن اقوال نقل کیے ہیں۔ انھیں کسی آیت کی تاویل و تفسیر میں جتنی بھی رائیں مل سکیں، وہ ساری رائیں انھوں نے کمال احتیاط اور کمال دیانت داری کے ساتھ محفوظ کر دیں۔ وہ اس بحث میں نہیں پڑے کہ ان میں کیا صحیح ہے اور کیا غلط، بلکہ یہ فیصلہ خود قارئین اور محققین پر چھوڑ دیا۔

مثال کے طور پر ہم سورۂ فجر کو لیتے ہیں۔ اس سورہ کی پہلی آیت ہے۔

"والفجر و لیال عشر و الشفع و الوتر و اللیل إذا یسر"

اس آیت میں "فجر" سے کیا مراد ہے؟ اس کے سلسلے میں امام قرطبیؒ (۸) اقوال